حقیقتِ صبر

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلماء سید علی نقی نقوی صاحب قبلہ طاب ثراہ

بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلیٰ سَیِّدِ الْاَنْبِیَآءِ وَالْمُرْسَلِیْن اَبِی الْقَاسِمِ محمّد خاتم النّبیّینَ وَآلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاھِرِیْنَ امّا بعد فقد قال اللّٰہ سبحانہ وتعالیٰ فی کتابہ المبین وھو اصدق الصادقین وبشّر الصابرین الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوا انا لِلّٰہِ و اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔اولئک علیم صلوات من ربّھم ورحمۃ واولئک ھم المھتدون۔

ارشاد ہو رہا ہے کہ خوش خبری دو ان صبر کرنے والوں کو کہ جب ان پر کوئی مصیبت آئے تو ان کا قول یہی ہو کہ ''ہم اللہ کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہم کو پلٹ کر جانا ہے'' یہ وہ لوگ ہیں جن پر درود ہے۔ان کے پروردگار کی طرف سے اور رحمت ہے، اور یہی لوگ راہِ ہدایت پر قائم ہیں۔

صبر کے مفہوم میں خود ایک تلخی داخل ہے۔اس لئے قرآن مجید نے یہاں انداز بیان عام متعارف طریقہ جو کلام کا ہے اس سے ذرا علٰحدہ اختیار کیا ہے۔عموماً جس چیز پر کوئی حکم لگایا جائے اس کا ذکر مقدم ہوتا ہے۔اور جو اس کا حکم ہو وہ موخّر ہوتا ہے ، جیسے **الّذین اٰمنو وعملوا الصالحات طوبیٰ لھم وحسن ماٰب**۔جنھوں نے ایمان اختیار کیا اور نیک عمل کئے یہ ہے محکوم علیہ یعنی جس پر حکم لگانا ہے۔اس کا ذکر پہلے ہو گیا۔اب وہ حکم کیا ہے، وہ بعد میں ہے کہ ان کے لئے طوبیٰ ہے اور بہترین بازگشت۔محکوم علیہ کا ذکر مقدم اور جو حکم لگایا جارہا ہے اس کا ذکر موخر۔اب یہاں تجزیہ کیجئے کلام کا، تو معلوم ہوتا ہے کہ حکم جس کا بیان کرنا ہے اور جن پر حکم لگایا جارہا ہے، وہ کون ہیں ''الصابرین'' صابرین یعنی جن کا وصف ہے صبر، ان کے لئے یہ ہے کہ **علیھم صلوٰت من ربھم ورحمۃ** تو محکوم علیہ، اور یہ ہے حکم، تو آغاز کلام ہوتا یوں کہ **ان الصابرین** یعنی صابرین۔ان کے لیے یہ ہے جو بعد میں بیان ہوگا۔لیکن اگر اس طرح آغاز کلام ہوتا تو لفظ صابرین کے گوش زد ہوتے ہی صبر کی وہ تلخی تو محسوس ہو ہی جاتی جو اس کے تحت میں مضمر ہے۔اس لئے قرآن مجید نے یہاں صابرین کی لفظ کہنے سے پہلے حکم یعنی بشّر کی لفظ کہہ دی تا کہ اس بشارت کی حلاوت اس تلخی کو محسوس نہ ہونے دے جو الصابرین کے لفظ میں مضمر ہے۔کسی کو بھی آپ دیکھیں کہ کوئی مصیبت اس پر پڑی ہے تو تلقین صبر اور تعزیت میں یہی الفاظ کہئے گا کہ صبر کرو۔مگر صبر کا اصلی مفہوم کیا ہے۔یہ میرے خیال میں بہت سے لوگوں کے ذہن میں ابھی نہیں پایا جاتا۔عموماً لوگ صبر کے مفہوم سے ناواقف ہیں۔آزاد خیالی کا دور ہے جس میں ہر چیز سے بغاوت پر فخر ہے۔سماج سے بغاوت، رواجوں سے بغاوت ، حکومت سے بغاوت، ماں باپ سے بغاوت ، بزرگوں کے وقار سے بغاوت اور سب سے بڑی ترقی کی نشانی خدا سے بغاوت۔تو اس موجودہ دور میں صبر کے معنی یہ سمجھے جاتے ہیں کہ جو بات ہو اسے سہہ لو اور کسی بھی طاقت کا مقابلہ نہ کرو۔اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ مذہب میں جو صبر کی تعلیم ہے، یہ بزدلی کی تلقین ہے۔یہ زبردستوں نے زیردستوں کی قوت مدافعت کو سلب کرنے کے لیے صبر کی تعلیم اور صبر کے فضائل بیان کئے ہیں تا کہ جو کچھ بھی ان کے ساتھ ہو، اس کو یہ خاموشی سے سہتے رہیں

اور اس پر ان میں بے چینی نہ پیدا ہو۔ یہ ایک بالکل جدید تصور صبر کے بارے میں پایا جاتا ہے جو اس مفہوم صبر سے متعلق ہے کہ بس جو ہوا سے چپکے سے سہہ لو۔ یہ ایک تصوّر روشن خیالی کے ماتحت صبر کے بارے میں ہے۔ دوسرا ایک تصور صبر کے بارے میں یہ ہے کہ جب مصیبت کوئی آئے تو تمہیں احساس مصیبت ہو ہی نہ۔ رنج و تکلیف کا احساس تم کو ہو ہی نہ۔ محسوس ہی نہ کرو کہ کیا ہو رہا ہے۔ یعنی احساس غم خلاف صبر ہے۔

تیسرا ایک تصور یہ ہے کہ نہیں، خیر محسوس تو ہو کوئی مصیبت آئے اس کا احساس تو قلب کو ہونا ہی چاہئے اور وہ ہوگا، لیکن آنکھ سے آنسو نہ نکلنا چاہئے۔ اگر آنکھ سے آنسو نکلا تو یہ خلاف صبر ہوگا۔ مختلف حلقوں میں اس قسم کے تصوّرات صبر کے بارے میں پائے جاتے ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ ان تمام تصوّرات کا پایا جانا خود میرے دعوے کی دلیل ہے کہ صبر کا اصلی مفہوم ابھی ذہن میں کسی کے نہیں ہے۔

آیئے پہلے مفہوم کا تجزیہ کریں۔ کیا صبر کے معنی یہ ہیں کہ چپکے سے ہر بات کو سہ لو۔ مقابلہ نہ کرو۔ حضور! صبر کی لفظ مذہبی ہی تعلیمات میں پہلے آپ کے گوش گذار ہوئی ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اسی کا صدقہ ہے جو یہ لفظ ہماری روزمرّہ کا جز بن گئی ہے، تو اب دیکھئے کہ قرآن مجید میں صبر کی لفظ کا کس کس محل پر استعمال ہوا ہے اور اس سے یہ اندازہ کیجئے کہ یہ آپ کا تصوّر صبر کے بارے میں ۔۔۔۔۔ کہ یہ بزدلی کی تعلیم ہے اور صبر کے معنی ہیں بلا مقابلہ ہر چیز کو برداشت کر لینا، یہ صبر کا مفہوم درست ہے یا نہیں؟ جب ہم قرآن مجید کا مطالعہ کرتے ہیں اور میں ہر شخص کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ مطالعہ کرے اور قرآن مجید میں تلاش کر کے دیکھ لے کہ اس صبر کی لفظ کا استعمال میدان جہاد میں ہے، جہاد کی منزل جو مقابلہ اور مقاومت کی ہے صبر ہی کی دعوت وہاں بھی دی گئی ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے۔ قرآن مجید کی آیت ہے جو پڑھ رہا ہوں "ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین" اگر تم میں بیس صبر کرنے والے ہوں تو دو سو ۲۰۰ پر غالب آنا چاہئے اور **وان یکم من کم مائه صابرة یغلبوا الفامن الذین کفروا** اور اگر تم میں سو ۱۰۰ صبر کرنے والے ہوں تو انھیں ایک ہزار ۱۰۰۰ ان افراد پر جو ایمان کی دولت سے محروم ہیں غالب آنا چاہئے **بانهم قوم لا یفقهون** یہ کیوں؟ یعنی دس گنے مقابلہ سے نہ گھبراؤ۔ دس کے مقابلہ میں تم کو غالب آنے کا تصوّر رکھنا چاہئے۔ اس کا فلسفہ کیا ہے؟ اس وجہ سے کہ وہ جماعت زیادہ سہی، دس گنی سہی مگر بصیرت ایمانی سے محروم ہے۔ یعنی تمہاری قلت عدد کا توازن پورا ہونا چاہئے تمہاری بصیرت ایمانی کی طاقت سے۔ اب یہاں کوئی حدیث نہیں بیان ہو رہی ہے جس میں قوی وضعیف کا سوال پیدا ہو۔ قرآن مجید کی آیت ہے جو میں پیش کر رہا ہوں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اکثر انسان کو خود اپنے بارے میں غلط فہمی ہوتی ہے۔ یعنی وہ نہیں سمجھتا کہ میں کتنے پانی میں ہوں تو جب یہ آیت نازل ہوئی ہے تو عام مسلمانوں کو تصور اپنے استحکام ایمانی کے بارے میں کچھ زیادہ تھا، اس لئے یہ معیار پیش ہوا۔ اس کے بعد اب قرآن مجید کی ترتیب میں تو بلا فاصلہ آیتیں ہیں معلوم ہوتا ہے جیسے اس آیت کے بعد ہی یہ آیت مگر مضمون خود بتاتا ہے کہ درمیان میں معرکۂ امتحان پیش ہوا، کوئی آزمائش کی کسوٹی آئی، جہاں مخاطب جماعت اس معیار پر پوری نہیں اتری تو دوسری آیت جواب بلا فاصلہ ہے وہ اس درمیان کے معرکہ کے بعد پھر آئی کہ **لان خفّف اللّٰہ عنکم**۔ اب اللہ نے تم سے تخفیف کر دی **وعلم ان فیکم ضعفاً** اور ثابت ہو گیا کہ تم میں کمزوری ہے۔

اب حضور! یہ مادی کمزوری تو ہے نہیں۔ وہ تو پہلے ہی معلوم تھا کہ ادھر ایک ہوتا ہے اور مقابل میں دس ہیں۔ مادّی کمزوری تو اسی سے نمایاں تھی۔ تو اب یہ کمزوری اس کے اس معیار کی کمزوری ہے جو باعث غلبہ بتایا گیا تھا یعنی بصیرت ایمانی جو اصل سبب تھا، دس گنے مقابلہ میں ہمّت نہ ہارنے کا۔ اس بصیرت ایمانی کی کمی ثابت ہو گئی۔ ثابت ہو گیا کہ تم میں کمزوری پائی جاتی ہے۔ اب گھٹ کر پھر یہ معیار ہے کہ فان یکن منکم

مائة صابرة یغلبو مائتین ۔ اب اگر تم میں سو ۱۰۰ صبر کرنے والے ہوں تو دو سو ۲۰۰ پر غالب آئیں "و ان یکم منکم الف یغلبو االفین" اگر تم میں ہزار ہوں تو دو ہزار ۲۰۰۰ پر غالب آئیں ۔یعنی کم سے کم دو نے مقابلہ سے تو نہ گھبراؤ۔ آخر میں پھر یہی معیار کہ ان اللہ مع الصابرین۔اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۔تو اب یہ میدان جہاد کا صبر کیا ہے کہ تلوار سر پر آئے تو چپکے سے سر جھکا دو۔ نیزہ آرہا ہو تو جلدی سے سینہ بڑھادو۔ یہ سب چپکے سے سہہ لو۔ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے میدان جنگ میں صبر کی تعلیم سے ظاہر ہو گیا کہ صبر کے جو معنی سمجھے گئے تھے وہ غلط ہیں۔صبر وہ چیز ہے جو دس ۱۰ گنے مقابلہ کی ہمّت پیدا کرتا ہے،تو یہ بزدلی کی تعلیم ہوئی یا شجاعت کی؟ معلوم ہوا کہ مفہوم صبر کا کچھ اور ہے ۔اب چاہے ابھی سمجھ میں نہ آئے کہ وہ کیا ہے لیکن یہ معلوم ہو گیا کہ یہ نہیں ہے اور یہ تصوّر کہ صبر بزدلی کی تعلیم ہے غلط ہے۔اچھا اب دیکھئے دوسرے صبر کے مفہوم کو کہ احساس غم نہ ہو۔ شعور مصیبت نہ ہو۔ یہ بھی ہرگز درست نہیں ہے۔

حضور والا! شعور انسان کی صفت خاص ہے۔کوئی صفت کمال انسان کی ایسی نہیں ہو سکتی جو شعور و احساس سے ٹکراتی ہو یعنی بے شعوری کبھی محل مدح نہیں ہو سکتی۔ اگر احساس غم ہی نہ ہوا تو صبر میں کارنامہ کیا ہوا،جس طرح اب کچھ ڈاکٹر صاحبان بغیر بے ہوشی سنگھائے آپریشن کر دیتے ہیں، اس طرح کہ اس حصّہ جسم پر جسے کاٹنا ہے ایسی دوائیں لگا دیتے ہیں کہ اس سے وہ بے حس ہو جائے اور ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ جتنے چاہے ٹکڑے کر ڈالیئے خبر ہی نہ ہوگی۔تو حضور اگر اس حصّہ جسم کو ماؤف کر دیا اور انسان نے اف نہ کی تو یہ اف نہ کرنا کون سا بڑا کارنامہ ہے۔ اسی طرح اگر کچھ دل و دماغ اس طرح کے ہو جائیں کہ احساس غم و مصیبت ہوتا ہی نہیں تو یہ کون اختیاری کارنامہ ہے ۔رہ گیا یہ تصور کہ نہیں احساس غم تو ہونا چاہئے لیکن آنکھ سے آنسو نہ نکلے۔بس معیار صبر یہ ہے مگر حضور والا! یہ دل اور آنکھ میں رابطہ کس نے قائم کیا۔کیا بات ہے کہ دل دکھتا ہے تو ہاتھ تو نہیں پسیجتا۔

کوشش بھی کیجئے تو پیر میں کوئی تغیّر نہیں پیدا ہوتا۔ یہ آنکھ ہی سے آنسو کیوں ٹپکتے ہیں۔معلوم ہوتا ہے کہ جو خالق ہے دل کا اور آنکھ کا، اس نے دل اور آنکھ میں کوئی ربط قائم کیا ہے جس کی وجہ سے دل پر چوٹ لگتی ہے تو آنکھ سے آنسو گرتا ہے۔تو اگر دل اور آنکھ کوئی مزاج معتدل سے خارج نہیں، دل بھی اپنی اصل فطرت پر ہے اور آنکھ بھی اپنی اصل فطرت پر ہے تو تقاضائے فطرت جو ہے اس پر دین فطرت پہرہ نہیں لگائے گا۔ کچھ حدوٗد و اعتدال قائم ہو سکتے ہیں، کچھ قیود ہو سکتے ہیں،لیکن یہ کہ اس فطرت کے تقاضہ پر پابندی عائد ہو جائے، یہ ناممکن بات ہے۔حضور یہ غلط فہمی حضرت پیغمبر خداؐ کے وقت میں بھی موجود تھی۔ آپ اپنے فرزند حضرت ابراہیم کی لاش پر جب تھے تو آپ کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تو حاضرالوقت اشخاص میں سے کسی صاحب نے کہا کہ انت یا رسول اللّٰہ تبکی، آپ یارسولؐ اللہ اور گریہ فرماتے ہیں یعنی کچھ دل میں یہ خلش تھی کہ آنکھ سے آنسو نکلنا، یہ بلندیٔ شان ایمان یا جلالت قدر انسان کے خلاف ہے مگر پیغمبر خداؐ نے اس کا جو جواب دیا ہے اور غلط فہمی کو دور کیا ہے میں ابھی پیش کروں گا۔معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصور بھی صحیح نہیں ہے۔تو پھر کیا ہے؟اب تو لفظ صبر بس ہے اور معنی صبر ہم سے بہت دور ہیں۔صبر کی لفظ تو ہمیں حفظ ہے، برابر ہم ہر ایک کو کہتے ہیں کہ صبر کرو مگر یہ صبر ہے کیا چیز، وہ جیسے ہماری سمجھ ہی میں نہیں آیا اور جیسے دنیا کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔تو جو میری سمجھ میں آیا ہے میں اسے پیش کروں، مگر پہلے ذرا اس کی وسعت پر نظر کیجئے۔ یہ صبر کی لفظ بہت سے محل پر استعمال ہوتی ہے ۔یہی صبر کی لفظ ان مصائب میں پیش ہوتی ہے جو بقضائے الٰہی آتے ہیں۔ جیسے کسی کے باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا عمر طبعی پر جاکے اور کسی بچّے نے داغ جدائی دے دیا، اور کوئی بھائی اٹھ گیا اور ایسے ہی مصائب جو تقدیر الٰہی سے آتے ہیں کیونکہ موت سب کے لیے ہے ۔کہا گیا ہے "تبارک الّذی بیدہ الملک وھو علیٰ کل شئی قدیر الذی خلق الموت والحیات لیبلوکم ایکم احسن

عملا۔" بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں سلطنت ہے کائنات کی ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ نے موت وحیات کا نظام قرار دیا ہے تا کہ تمہاری آزمائش کرے کہ کس کے اعمال بہتر ہیں۔ تو یہ دنیا، اس کو دائمی بنایا ہی نہیں گیا اور جہاں تک کہ ہمارا اور آپ کا تصور ہونا چاہئے تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ موت کوئی بری چیز نہیں ہے اور اس کی ایک بڑی دلیل جو کم از کم مسلمانوں کے لئے قطعی حیثیت رکھتی ہے اور اگر میں اسے پھیلا دوں، وسیع کر دوں تو دنیا کی ہر جماعت کے لیے۔ مسلمانوں سے میں کہتا ہوں کہ حضرت پیغمبر خدا کا لقب خصوصی ہے، "حبیب اللہ" حبیب اللہ کے معنی ہیں اللہ کا محبوب اور پھر وسیع کر کے میں ہر جماعت کے لیے یوں پیش کر سکتا ہوں کہ کچھ نہ کچھ افراد ہر ایک کے نزدیک ایسے ہیں جو اللہ کے پسندیدہ افراد تھے۔ تو اگر موت اللہ کے نزدیک کوئی ناپسند چیز ہوتی تو کوئی ناپسند بات کو اپنے محبوب کے واسطے نہیں گوارا کرتا۔ تو اب وہ عالم معنیٰ کی حیات تو دوسری چیز ہے جس کے لحاظ سے شہداء جاودانی زندگی رکھتے ہیں، اور اس سے بالاتر حیات ہی کا درجہ ہے جو اپنی جگہ ثابت چیز ہے مگر وہ عالم معنیٰ کی حیات ہے، ورنہ جہاں تک کہ اس دنیا کی موت کا سوال ہے تو جیسا کسی شاعر نے بھی کہا ہے ۔

جب احمد مرسلؐ نہ رہے، کون رہے گا

یعنی موت سے جب افضل کائنات اور مقصد تخلیق عالم مستثنیٰ نہ رہا تو اور کون مستثنیٰ رہے گا؟ ماننا پڑے گا کہ خدا کے نزدیک یہ کوئی بری چیز نہیں ہے، ورنہ اپنے محبوبؐ کو اس سے بری رکھتا۔ اسی طرح وسیع حلقہ میں ہر جماعت کے نقطہ نظر سے کچھ نہ کچھ افراد تو ایسے ہی ہیں جو خدا کو پسند ہوں، ہر مومن بقدر ایمان اور ہر نیک آدمی بقدر اپنی نیکی کی حد تک، ہر انسانی جوہر رکھنے والا بقدر اس جوہر اخلاق کے خدا کو پسند ہے۔ تو جتنا بھی کسی نقطۂ نظر سے پسندیدۂ رب انسان ہو، چاہئے یہ تھا کہ وہ بری رہتا موت سے ۔ حضور! بالکل بری نہ رہتا تو کم از کم بروں کو موت جلدی آتی ۔ اچھوں کو موت دیر میں آتی کہ زیادہ عرصہ تک وہ اس دنیا کی خیر و برکت سے فائدہ اٹھا سکیں ۔ یہی صلہ ہوتا ان کے حسن عمل کا۔ مگر آپ کا مشاہدہ ہے کہ بہت سے برے آدمی بہت مدّت تک رہتے ہیں اور بہت سے اچھے بہت جلدی چلے جاتے ہیں ۔ بلکہ دنیا والوں کا ایک مقولہ یہ ہے کہ اچھے آدمی جلدی اٹھ جاتے ہیں ۔ زیادہ تر ایسا ہوتا ہے یا یہ ان کی اچھائی کا ایک اثر ہوتا ہے کہ وہ جب بھی اٹھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ بہت جلدی اٹھ گئے ۔ بہر حال کوئی اچھا آدمی اس سے بری نہیں ہے ۔ کوئی اللہ والا اس سے بری نہیں ہے۔ کوئی بڑا نیکو کار اس سے بری نہیں ہے۔ تو اب ہمیں آپ کو کیا حق ہے یہ سمجھنے کا کہ موت کوئی بری چیز ہے ۔ یہ دنیا کی موت، اس کے لیے تو قرآن مجید میں صراحتاً کہہ دیا کہ "**وما محمداً الا رسول قد خلت من قبله الرسل افائن مات۔۔۔۔۔۔**"

ہمارا محمدؐ سوا رسولؐ کے کچھ اور نہیں ہے۔ یہ سوا رسول کے کچھ اور نہیں ہے اس کا مطلب یہ کہ خدا نہیں ہے، جو **حی لا یموت** ہو جتنے بھی اونچے درجہ کے سہی مگر وہ رسالت ہی کے دائرہ میں ہیں ۔ نہیں ہیں مگر رسولؐ جن کے پہلے بہت سے رسول آئے اور چلے گئے ۔

افان مات تو کیا اگر یہ مر جائیں یا قتل ہو جائیں تو تم الٹے پاؤں پلٹ جاؤ گے؟ یہ مسلمانوں کو انتباہ کیا گیا ہے کہ تمہاری وفاداریاں رسوؐل کی حیات کے ساتھ مخصوص نہیں رہنا چاہئے اور دوسری جگہ صراحتاً کہہ دیا گیا ہے کہ **انک میت وانهم میتون** ۔ آپ بھی مرنے والے ہیں اور یہ سب بھی مرنے والے ہیں ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ بھی موت سے مستثنیٰ نہیں رکھے گئے ہیں ۔ اس کے لیے بجز خدا کوئی نبی کوئی ولی اور کوئی ایسا نہیں کہ جو موت سے مستثنیٰ کیا گیا ہو۔ اختلاف مدّت عمر دوسری چیز ہے، کسی نبی کی عمر کم ہوئی کسی کی زیادہ ہوئی ۔ کوئی رسول کچھ تھوڑے عرصہ تک رہا، کوئی رسول زیادہ عرصہ تک ۔ اس میں بھی اگر آپ جانچ کیجئے تو معلوم ہو گا کہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ افضل کی عمر کم ہوتی ہے اور غیر افضل کی عمر زیادہ ہوتی ہے اور

مسلمانوں کے متفق علیہ عقیدہ میں حضرت ابراہیمؑ بالاتر ہیں ہمارے پیغمبرؐ کے پہلے تمام انبیاؑء سے، مگر قرآن سے ثابت ہے کہ جناب نوحؑ کی جتنی عمر ہوئی اتنی حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی نہیں ہوئی اور جتنی حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی ہوئی، اتنی بھی حضرت محمد مصطفیؐ کی عمر شریف نہیں ہوئی۔ امم سابقہ میں اکثر عمریں زیادہ ہوئیں، اور اس امت مرحومہ میں زیادہ تر عمریں کم قرار دی گئیں۔ بہرصورت، عمر کی زیادتی اور کمی کے درجے مختلف ہو سکتے ہیں، اور پیمانے اس کے جدا جدا ہو سکتے ہیں مگر انتہا ایک ہی منزل پر ہے۔ یہ کشتیٔ عمر رواں ساحل تک پہنچنا ضروری ہے اور اس ساحل حیات کا نام ہے موت۔

اب عزیزوں کی موت پر ہمارا کیا کام ہے؟ صبر کرنا۔ اس صبر کا کیا مطلب؟ یہ کہ اسے برداشت کرلو۔ قدرت کی طرف سے آنے والی اس مصیبت کو سہہ لو۔ آخر اس سہنے کا کیا مطلب ہے؟ نہ سہیں گے تو ہم کریں گے کیا؟

معلوم ہونا چاہئے کہ یہاں صبر کا یہ مطلب ہے کہ جو کچھ فیصلہ تقدیر ہوا ہے اسے غلط نہ سمجھو۔ خدا کا شکوہ نہ کرو۔ اس کے فیصلہ پر معترض نہ ہو۔ یہ تقاضائے ایمان ہے۔ یہ وہ اختیاری پہلو ہے جس کا ہم سے مطالبہ ہے اور اس سے بلند وہ صبر ہے جو راہ حق میں مشکلات برداشت کرنے کی صورت میں ہوتا ہے، یہ ہے صبر اختیاری۔ یعنی یہ اپنے کردار سے متعلق چیز ہے۔ مثلاً رسولؐ کے جسم مبارک پر پتھر برس رہے ہیں۔ یہ پتھر بلا وجہ نہیں برس رہے ہیں بلکہ آپ کوئی پیغام دے رہے ہیں جو انہیں پسند نہیں ہے، اس لیے پتھر برس رہے ہیں۔ تو اگر یہ پیغام دینا آپ چھوڑ دیں تو پتھر برسنا ختم ہو جائیں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ پتھر اپنے ہاتھوں برس رہے ہیں مگر صبر کی تعلیم ہے کہ پتھر کھاتے رہئے، اپنے راستہ سے نہ ہٹئے۔ یاد رکھئے، یہی وہ چیز ہے کہ کوئی صاحب کردار کرتا ہے تو دنیا والے کہتے ہیں کہ بڑا ضدّی ہے، کہتے ہیں گھر لٹا دیا۔ یزید کی بیعت نہ کرلی۔ کیوں ضد سے کام لیا ہے؟ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ ضد نہ ہوتی تو آج یہ پیغام حق ہم تک پہنچتا ہی نہ، کیونکہ جس نبیؐ پر کوئی شدت وقت پیش آتی وہ راہ سے ہٹ جاتا۔ پھر نہ نوحؑ قائم رہتے اپنے پیغام پر، نہ ابراہیمؑ قائم رہتے اپنے پیغام پر، نہ موسیٰ قائم رہتے، نہ عیسیٰؑ قائم رہتے یا کسی کے بھی نقطہ نظر سے جس نے بھی راہ حق میں کوئی قربانی دی ہو، اس نے حقیقت میں آخر دم تک مشکلات کو برداشت کر کے اثبات قدم دکھایا ہے، تب وہ پیغام بعد کی نسلوں تک چھوڑا ہے۔ ورنہ اگر شدّت وقت کے ڈر سے گھبرا کر وہ ہٹ جاتا تو آج حق کا ورثہ ہم تک پہنچتا کیونکر؟

حضرت ابراہیمؑ آگ میں کیوں ڈالے جاتے اگر یہ نمرود کے ہم خیال بن جاتے حضرت موسیٰؑ کو ملک کیوں چھوڑنا پڑتا، دربدری کیوں اختیار کرنی پڑتی، مسافرت کیوں اختیار کرنا پڑتی، اور دشت نوردی کیوں سہنا پڑتی، اگر فرعون جو کچھ کہتا تھا اس کے یہ ہم خیال ہو جاتے۔ حضرت یحیٰؑ بن زکریاؑ کا سر کیوں قلم ہوتا اگر وہ بادشاہ وقت جو کچھ کہتا تھا اس کے مطابق فتویٰ دے دیتے۔ جناب زکریاؑ آرے سے کیوں چیرے جاتے اگر ہم رنگ جماعت بن جاتے اور حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیوں تیرہ برس جسم مبارک پر پتھر کھاتے، اگر اس کلمۂ حق کو نہ کہتے کہ ''قولو الا الٰہ الا اللہ'' کہو کہ اللہ بس ایک ہے، تمہارا ہی بھلا ہوگا۔ معلوم ہوگا کہ مصائب و مشکلات سے ڈر کر ان میں سے کسی نے اپنا راستہ نہیں بدلا۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے مقابلہ میں اپنا راستہ نہیں بدلا۔ حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کے مقابلہ میں اپنا راستہ نہیں بدلا۔ حضرت یحیٰؑ نے اپنے دور کے طاغوت باطل کے مقابلہ میں اپنا راستہ نہیں بدلا۔ حضرت محمد مصطفیٰؐ نے اپنے مقابل والے افراد، ابوجہل و ابولہب اور ابوسفیان کے مقابلہ میں راستہ نہیں بدلا۔ یہ تو اتنے نام میں نے لے لئے، ورنہ میں یہ کہتا ہوں کہ ایک لاکھ چوبیس ۲۴ ہزار انبیاؑء نے اپنا راستہ کبھی نہیں بدلا، اہل باطل کے مقابلہ میں باوجود اس شدت وقت کے جو ان کے سامنے آئی۔ تو جب اتنی نظیریں شروع سے آپ کے سامنے موجود ہیں تو حسینؑ سے اس بدعت کا

مطالبہ کیوں ہے کہ یہ یزید کے لیے اپنا راستہ بدل دیں۔ ان کے نانا نے اپنا راستہ نہیں بدلا، اپنے وقت کے یزیدوں کے مقابلہ میں اور یہ اپنا راستہ نہیں بدلتے اپنے دور کے ابوجہل کے مقابلہ میں، اپنے دور کے ابولہب کے مقابلہ میں اور اپنے دور کے وارث ابوسفیان کے مقابلہ میں ۔ وہ جو ادھر کا کردار ہے وہ ابوسفیانی ورثہ ہے، اور یہ جوان کا کردار ہے یہ حضرت محمد مصطفیٰؐ کی میراث ہے۔ بہت سے اس مجمع میں وہ افراد ہوں گے جو دس محرم کو عاشور کے دن زیارت پڑھتے ہیں اور حضرت امام حسین علیہ السلام کے لیے یہ الفاظ صرف کرتے ہیں۔

السلام علیک یا وارث آدم علیہ السلام صفوۃ اللہ السّلام علیک یا وارث نوح علیہ السلام نبی اللہ السّلام علیک یا وارث ابراھیم خلیل علیہ السلام اللہ السّلام علیک یا وارث موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ السّلام علیک یا عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ السّلام علیک یا وارث محمّد حبیبؐ اللہ۔

حضور! اگر یہ نسبی میراث ہوتی تو امام حسینؑ آدمؑ کے وارث ہوسکتے ہیں۔ نوحؑ کے وارث ہوسکتے ہیں۔ ابراہیمؑ کے وارث ہوسکتے ہیں مگر موسیٰ اور عیسیٰؑ کے وارث کیوں کر ہوں گے۔ وہ نبی اسحٰق ہیں اور یہ نبی اسمٰعیل ہیں۔ معلوم ہوتا ہے یہ خاندانی وراثت نہیں ہے، یہ منصبی وراثت ہے۔ یہ کام کی وراثت ہے۔ یہ فرض کی وراثت ہے۔ یعنی وہ تحفظ حق کی ذمّہ داری جو آدمؑ کے وقت سے شروع ہوئی اس کو ہر ایک نے اپنے دور میں نباہا اور اسے آج حسینؑ ابن علیؑ اپنے وقت میں نباہ رہے ہیں۔ یہ کیا ہے صبر۔ باطل کے مقابلہ میں اپنے کردار پر قیام کے ساتھ اور اسی لفظ صبر کا استعمال ہے شریعت میں۔ واجبات ومحرمات کی پابندی کے لیے۔ جتنے واجبات ومحرمات ہیں، یعنی پابندیٔ شریعت سب صبر کے تحت میں داخل ہیں۔ علماء کہتے ہیں صبر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک صبر عن المحبوب اور دوسرا صبر علی المکروہ۔ صبر عن المحبوب یعنی پسندیدہ طبع چیز کی جدائی پر صبر، اور صبر علی المکروہ یعنی ناگوار طبع بات پر صبر، تو واجبات جتنے ہیں جن کے فعل کی پابندی ضروری ہے، یہ **صبر علی المکروہ** میں داخل ہیں یعنی ناگوار طبع بات پر صبر۔ حضور ایک ناگواری تو پابندی کی فطرت میں مضمر ہے۔ وہی کام آپ خوشی سے کرتے رہیں بار نہیں ہوگا۔ لیکن جب حکماً عاید ہوجائے تو اسی دن سے بار ہوجائے گا۔ کوئی سیر گاہ ہو۔ کوئی سڑک ہو جہاں لوگ تفریح کے لیے ٹہلنے جاتے ہوں جو کوئی از خود اس سڑک پر جایا کرے تفریح ہوگی لیکن جس دن سے کوئی کام ہوجائے گا کہ روز ادھر ہمیں ضرورۃً جانا ہے تو تفریح ختم ہوجائے گی، اور بس تھکن رہ جائے گی۔ بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبرا جائے اور لیٹ جایئے تو خوب آرام آئے گا، لیکن کہیں ڈاکٹر صاحب نے آرام تجویز فرما دیا تو ان کے دل سے پوچھئے جنھیں ڈاکٹر صاحب نے مکمل آرام کی ہدایت کردی ہے کہ وہ مکمل آرام کتنی مکمل تکلیف ہے۔ بس جب پابندی ہوگئی تو بار خاطر۔ اس لیے احکام شرع کا نام ہی ہوا تکلیف، جس کے لحاظ سے کہتے ہیں کہ انسان مکلّف ہے یعنی تکلیفات شرعیہ اس کے ذمہ ہیں، خصوصاً جب کہ پابندی میں واقعی کچھ سختی و ناگواری ہو جیسے گرمی کا روزہ۔ ظاہر ہے کہ جاڑے کے زمانہ کا روزہ وہ تو یوں کہیئے کہ بات کہتے گذر جاتا ہے، مگر اسے بھی نہ رکھنے والے نہیں رکھتے۔ یہ بس وہی پابندی والی ناگواری ہے جسے برداشت نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ اس میں اور کوئی ناگواری نہیں ہے لیکن مئی جون کا روزہ مسلسل تیس ۳۰ دن صبح سے لے کر شام تک۔ اتنا بھی ہمیں اختیار نہیں کہ جاڑے میں دن کو رکھا کرتے اور گرمی میں رات کو رکھا کرتے۔ اتنے ہی گھنٹے سو کر گذار دیں دن میں۔ جی نہیں، وہ تو جس وقت جاڑے میں رکھنا ہے، اسی وقت گرمی میں رکھنا ہے، بلکہ جاڑے میں دن چھوٹا ہوتا ہے اس لئے تھوڑے گھنٹے۔ گرمی میں دن بڑا ہوتا ہے لہٰذا۔ چودہ گھنٹے پندرہ گھنٹے۔ پھر جناب روزہ ایسا کہ پھل کا عرق بھی نہیں پی سکتے۔ کوئی چیز، پانی بھی نہیں پی سکتے۔ کسی طرح کی کوئی شئے، کوئی غذا، کچھ بھی نہیں۔ اس میں واقعی ناگواری ہے، تکلیف ہے۔ یہی حقیقت ہے کہ جسے حضرت علی علیہ السلام نے

بڑے بلیغ الفاظ میں فرمایا ہے۔ اس میں ذرا عربی زبان سمجھنے پر اس کی لطافت کا سمجھنا موقوف ہے تو پہلے یہی سمجھ لیجئے کہ ''بارد'' کے معنی ہی ٹھنڈے کے اور حار کے معنی ہیں گرم۔ اس کے ساتھ ایک اور محاورہ ہے عرب کا۔ غنیمة باردة۔ بغیر لڑے بھڑے ہوئے جو مال غنیمت مل جائے، اسے کہتے ہیں غنیمت باردہ۔ تو حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے فرمایا ہے۔ **الصّوم فی الحر جهاد وفی الشتآء غنیمة بارده**۔ گرمی میں روزہ جہاد ہے اور جاڑے میں غنیمت باردہ ہے یعنی وہ مال غنیمت جو بغیر لڑے بھڑے مل جائے۔ اسی طرح نماز کے لیے وضو لازم ہے۔ گرمی میں وضو بڑا باعث سکون ہے، لیکن جاڑے میں، اور صبح کی نماز کا وضو؟ جو پڑھتے ہیں ان کے دل سے پوچھئے، کہ وہ اس میں اتنی ناگواری نہیں محسوس کرتے، مگر جو اتفاقاً کبھی نماز پڑھ لیتے ہیں ان کو اس میں کتنی ناگواری محسوس ہوتی ہے۔ وضو کرنے میں سردی کتنی محسوس ہوتی ہے۔ آپ کی تکلیف بلا وجہ خدا کو پسند تھوڑی ہے۔ اسے تو یہ دیکھنا ہے کہ اس کے حکم کی قیمت آپ کے نگاہ میں کتنی ہے۔ آسانی کے دور میں بھی وہ فرض انجام دو، دشواری کے وقت میں بھی۔ ہاں، اگر بیماری کا خطرہ ہے تو وہ خود حکم بدل دیتا ہے۔ مگر تمہیں بیماری کا خطرہ نہیں ہے، صرف ناگواری ہے۔ صرف ذہنی کاہلی ہے اور جسمانی راحت پسندی ہے تو اس کا احترام نہیں۔ بیمار اگر ہو یا اگر مضر ہو۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا ہے تو نہیں، پھر وضو کے بدلے تیمّم کرلو۔ لیکن صرف اس لیے کہ سردی لگے گی، وضو نہ کرو تو یہ آرام پسندی ہے۔ یہ اس کے حکم کی اہمیت کا تقاضا نہیں ہے۔ لیکن اگر اس حکم کو باوجود اس تکلیف کے انجام دیا تو یہ صبر ہے۔ اس صبر کی کتنی قدر و قیمت ہے، وہ ہم آپ نہ محسوس کریں لیکن تاڑنے والی نگاہوں نے اسے محسوس کیا ہے۔ مغربی مصنفین کی کتابوں میں اس واقعہ کا تذکرہ موجود ہے کہ جب صلیبی لڑائیاں ہو رہی تھیں۔ عیسائیوں یعنی اہل مغرب اور مسلمانوں میں وہ مسلسل لڑائیاں جنہیں یورپ نے جہاد قرار دیا تھا مسلمانوں کے مقابلہ میں اور وہ بہت طولانی مدّت تک قائم رہی تھیں۔ وہ صلیبی لڑائیاں اس لئے کہلاتی ہیں کہ صلیب عیسائیوں کا مذہبی نشان ہے تو اس کی حمایت میں یہ لڑائیاں ان لوگوں نے لڑی ہیں جو اسلام پر یہ اعتراض کرتے رہے ہیں کہ اس نے تلوار سے دین کی تبلیغ کی مگر ان لڑائیوں میں یہ تلوار خود صلیب کی طرف سے اٹھائی گئی تھی۔ بہرحال اس موقعہ کا تذکرہ ہے کہ ایک یورپین فوج کا سالار ہے جو ایک دریا کے کنارے پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا اور وہاں اس کا مستقر تھا۔ برف باری ہو رہی تھی۔ صبح سویرے اس نے اپنے ایک ماتحت افسر سے کہا کہ ذرا جا کے دشمن کی فوج کی خبر لے آؤ۔ مسلمانوں کی فوج کی نقل وحرکت کو ذرا دیکھ آؤ کہ ان کا کیا منصوبہ ہے۔ کتنی دور تک وہ پہنچے ہیں تو اس نے کہا کہ برف باری ہو رہی ہے۔ بھلا یہ وقت نکلنے کا ہے اور وقت کی شدّت ایسی تھی کہ باوجودیکہ فوجی قانون یہ ہے کہ عدول حکمی پر گولی مار دینے کی سزا تک کا اختیار ہے مگر شدّت وقت نے افسر کو چپ کر دیا اور گویا وہ قائل ہو گیا کہ ہاں بیشک یہ وقت نکلنے کا نہیں ہے۔ مگر عین اسی موقعہ پر صحرائی عربوں میں سے جو پاس بسے ہوئے تھے، ایک عرب آیا اور اس نے اس دریا پر سے کہ جس پر برف کی تہہ جمی ہوئی تھی اپنی مٹھی سے برف کو توڑ کر پانی نکالا اور اس سے وضو کیا اور اسی زمین پر کھڑے ہو کر جس پر برف کی چادر پڑی ہوئی تھی، دو رکعت نماز صبح پڑھی۔ بس یہ دیکھتے ہی اس افسر نے اپنی اس ماتحت سے مخاطب ہو کر کہا کہ دیکھو تمہارا سالار آنکھوں کے سامنے موجود ہے اور وہ تمہیں حکم دے رہا ہے مگر تم سردی کا عذر کر رہے ہو اور ان کا فرمانروا کتنی مدّت ہوئی وہ ان کو حکم دے کر دنیا سے رخصت ہو گیا مگر اس وقت تک ان کے اوپر اس کا ایسا اثر ہے کہ اس عالم میں یہ اس کے حکم کی تعمیل کر رہے ہیں۔ یہ یاد رکھو (اس سالار نے اپنے اس ماتحت سے کہا) کہ اس قوم میں جب تک یہ جوہر موجود رہے گا کوئی دنیا کی قوم ان سے مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اب یہ آج کل کے روشن خیال مسلمان ہیں جو نماز کو بس اٹھا بیٹھی سمجھ کر اس روح و طاقت کو نہیں دیکھتے جو ان پابندیوں میں مضمر ہے جو دیکھنے

والے تھے انھوں نے محسوس کیا اور اب اس فقرہ پر غور کیجئے کہ کوئی طاقت اس قوم کو جب تک (یہ) جو ہر اس میں موجود ہے، مغلوب نہیں کر سکتی تو اب تجزیہ کیجئے کہ یہ جو ہر کیا ہے۔ یہ جو ہر وہی ہے ''صبر''، یعنی حکم الٰہی کی تعمیل میں شدائد کا برداشت کرنا۔ معلوم ہوا کہ جتنے واجبات ہیں ان کی پابندی صبر میں داخل ہے اور حضور، جتنے محرمات ہیں، ناجائز کام ان میں پابندی ترک کی ہے ۔ یہ صبر عن المحبوب میں داخل ہے۔ پسندیدہ طبع چیز سے صبر۔ کیونکہ جیسے پابندی وہاں پر بار خاطر ہے اسی طرح یہ بات ہے کہ **الانسان حریص علی مامنع** جس چیز سے روک دیا جائے اسی کو دل چاہنے لگتا ہے۔ کوئی غذا کبھی آپ نوش جان نہ فرماتے ہوں لیکن جس دن سے حکیم صاحب یا ڈاکٹر صاحب پرہیز بتادیں گے کہ یہ نہ کھاؤ، اسی دن سے بس اسی چیز کو دل چاہنے لگے گا۔ یہ ہے کمزوری، انسانی طبیعت میں کہ جس چیز پر پابندی عائد ہوجائے، اسی کے لئے دل چاہئے لگتا ہے۔ لہٰذا جس چیز سے ممانعت کی گئی ہے اس کے ترک پر قائم رہنا، یہ صبر عن المحبوب ہے۔ روزہ کا نام ہی صبر ہوگیا۔ **و استعینوا بالصبر و الصّلوۃ** مدد حاصل کرو صبر اور صلوٰۃ کے ساتھ۔ علماء کہتے ہیں کہ یہاں صبر کے معنی ہیں روزہ۔ کیوں روزہ صبر ہے؟ اس لئے کہ بہت سی خواہشوں کو مارنا پڑتا ہے۔ لہٰذا وہ ہمہ تن عبادت ہی صبر بن گئی۔ تو اب یہ اتنی جگہ جو صبر کی لفظ کا استعمال ہوتا ہے، کیا ہر جگہ صبر کے کوئی نئے معنی ہیں۔ میرے خیال میں کوئی نئے معنی نہیں ہیں بلکہ صبر کا ایک عام مفہوم ہے جو سب جگہ پایا جاتا ہے، وہ صبر کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شدّت وقت، کوئی سختی، کوئی ناگواری تم کو اس جادہ سے نہ ہٹائے کہ جس پر قائم رہنا تمہارا فرض ہے۔ جس کردار پر تمہیں رہنا چاہئے، اس کردار سے کوئی چیز تم کو ہٹا نہ سکے۔ اب کوئی چیز، خواہ وہ طبیعت کی ناگواری ہو، خواہ وہ دشمن کا زبردست حملہ ہو، خواہ وہ وقت کی شدت ہو، کوئی چیز تم کو اس راستہ سے نہ ہٹا سکے جس پر تمہیں قائم رہنا چاہیے۔ یہ ہے عام مفہوم صبر کا اور ہر جگہ یہی پایا جاتا ہے۔ اب یہ کہ فرض کیا ہے، اسے الگ سے سمجھنا ہوگا، وہ صبر کے مفہوم کا جز نہیں ہے۔ اب صبر کے تقاضے مختلف ہوجائیں گے، اگر ساکت رہنا انسان کا فرض ہے تو اٹھ کھڑا ہونا بے صبری ہوگا اور اگر اٹھ کھڑا ہونا فرض ہے تو بیٹھا رہنا خلاف صبر ہوگا اگر کلام انسان کے لئے صحیح ومناسب ہے، تو چپ رہنا خلاف صبر ہوگا، اور اگر چپ رہنا انسان کے لئے اصلح ہے تو بول اٹھنا خلاف صبر ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صبر کا جوہر ایک ہوگا۔ تقاضے عمل کے مختلف ہوں گے۔ کوئی صلح کرکے بیٹھ جائے گا، وہ صابر ہوگا۔ کوئی تلوار لے کر کھڑا ہوجائے گا، وہ صابر ہوگا۔ باوجود ہزار طعنوں کے صلح کے راستہ پر قائم رہنا، یہ اس کے صابر ہونے کا ثبوت ہے، اور لاتعداد مشکلات کے علاوہ آج تک کے اعتراضات کے باوجود پھر بھی راہ حق پر تلوار لے کر کھڑے رہنا، یہ اس کے صبر کا معیار ہے۔ صبر کی حقیقت ایک ہے تقاضے وقت کے مختلف ہیں۔ ایک طرف بڑا نواسہؑ رسولؐ کا ہے حسن مجتبیٰؑ، دوسری طرف چھوٹا نواسہ ہے رسولؐ کا حسینؑ شہید کربلا۔ حسن مجتبیٰؑ صلح کر لیتے ہیں، حسینؑ تلوار لے کر کھڑے ہوجاتے ہیں۔ یہ تو دو شخصیتوں میں دو عملی مثالیں ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اس کے پہلے تو ایک ہی شخصیت میں یہ مثالیں آتی رہیں۔ پیغمبرؐ خدا تیرہ برس جسم پر پتھر کھاتے ہیں اور تلوار نہیں کھینچتے، اور وہی پیغمبرؐ خدا ہیں کہ جو مدینہ میں آنے کے بعد فوجوں کی قیادت کر رہے ہیں، اور میدان جہاد میں۔ یہ بھی نہیں کہ ساتھیوں کے سہارے پر قائم رہتے ہوں، بلکہ جب صفحۂ میدان سادہ ہوجاتا ہے تو تن تنہا اپنی جگہ برقرار رہتے ہیں، جب کہ ان کے پاس کوئی نہیں موجود تھا۔ صرف ایک شیر تھا جو لشکر میں ڈوبا ہوا شمشیر زنی کر رہا تھا اور ان پر تابڑتوڑ حملے ہو رہے تھے، تو پھر جب کہ ایک ہی شخصیت میں یہ دونوں مثالیں ہیں جس کا سبب صرف محل کا تقاضہ ہوسکتا ہے، تو دو شخصیتوں میں یعنی امام حسنؑ اور امام حسینؑ میں اگر یہ دو نمونے پیش آئیں تو انھیں بھی باہمی اختلاف پر محمول سمجھنا غلط ہوگا۔ بلکہ یہ حالات کے بدلنے سے فرض کا بدل جانا ہے۔ وہ ۴۰ھ کا تقاضہ تھا جو امام حسنؑ نے کیا اور

یہ ۶۱ھ کا تقاضا ہے جسے امام حسینؑ انجام دے رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صبر کے تقاضے ہوتے ہیں، جو مختلف طور پر سامنے آتے ہیں۔ اب آیئے دیکھئے کہ اس طرح کے سانحے جیسے ہمیں اور آپ کو روزمرّہ پیش ہوا کرتے ہیں یعنی کوئی عزیز اٹھ گیا، کوئی دوست جدا ہوگیا، اور اس سانحہ کی تو نوعیت دوسری ہے جس ذیل میں ہم آج جمع ہوئے ہیں، اس میں تو ظالموں کا عمل بھی شریک ہے۔ یعنی گذرنے والا بستر پر مرنے والا نہیں ہے بلکہ مقتول ہے، ظالم کے حربہ کا نشانہ ہے۔ مگر فرض کیجئے یوں ہی وقت آ گیا ہوتا اور مرحوم اپنے گھر ہی پر ہوتے اور دنیا سے اٹھتے، تب بھی عزیزوں کے لئے تو سانحہ یہی سانحہ تھا۔ اولاد پھر بھی روتی ہوتی۔ بھائی پھر بھی اشکبار ہوتے، اور ان کے متعلقین پھر بھی ان کے غم میں نالہ کناں ہوتے۔ بلکہ عزیز و اقارب کا کیا ذکر ہے جن جن کو شناسائی ان سے تھی جو ان کے اوصاف سے واقف تھے، جو ان کے حالات سے باخبر تھے، جو ان کی خوبیوں پر مطلع تھے، جو ان کے اخلاق سے متاثر تھے، جن کو ان سے کوئی فیض پہنچتا تھا، ہر ایک یہی ایک اثر محسوس کرتا۔ حقیقت میں جو اٹھتا ہے تو وہ تاریخ کے شمار میں آنے پر ایک واقعہ ہوتا ہے کہ اس شخص کا انتقال ہوگیا، لیکن درحقیقت وہ ایک سانحہ نہیں ہوتا بلکہ بہت سے سانحے ہوتے ہیں ہر آدمی کے تناسب سے، مثلاً ایک سانحہ یہ ہے کہ اس اولاد کا باپ اٹھ گیا تو اس کے لئے یہ سانحہ ہے۔ ایک سانحہ یہ ہے کہ بیوہ لاوارث ہوگئی، اس کا وارث دنیا سے چلا گیا۔ اس کے لحاظ سے یہ سانحہ ہے۔ بھائی موجود ہیں، تو ان کا قوت بازو دنیا سے اٹھ گیا، یہ ان کے لیے سانحہ ہے۔ تو ہر آدمی کے اعتبار سے سانحوں کی تعداد ہوتی ہے، جو اس ایک واقعہ سے پیش آیا کرتے ہیں۔ اور پھر جتنا فیض رسانی کا سلسلہ وسیع ہوا، اتنے ہی اس کے حدود اثر بڑھتے ہیں اور اس کے لحاظ سے حوادث کی تعداد زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لئے پیشوایان مذہب کا دنیا سے اٹھنا جو ہوتا ہے اس کا اثر ہمہ گیر ہوتا ہے، کیوں کہ وہ ہر انسان سے تعلق رکھتے ہیں۔ بہت سے افراد وہ ہوتے ہیں جو اپنے باپ کا سایہ اٹھتے ہوئے محسوس کرتے ہیں۔ بہت سے افراد وہ ہوتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا ولی نعمت تھا، وہ چلا گیا۔ اسی طرح دائرہ میں وسعت ہوتی رہتی ہے۔ فیوض رسانی کے اثر کے ساتھ۔ اب اس طرح کے مصائب جو تقاضائے مشیت الٰہی سے ہوتے ہیں اس میں آدمی نہ سہے گا تو کیا کرے گا۔ اپنے اختیار کو تو اس میں کوئی دخل نہیں ہے، اب یہاں صبر کا تقاضہ کیا ہے؟ صبر کا تقاضہ وہاں یہ ہے کہ تم یہ محسوس کرو کہ جو ہوا وہ غلط نہیں ہوا؟ قضائے الٰہی کا فیصلہ نامناسب نہیں ہے، یہ ہے مطالبۂ صبر۔ روزمرہ کی مثال اس کی یہ ہے کہ ایک انگلی میں زخم ہوا''۔ یا کسی حصّہ جسم میں ڈاکٹر نے آپریشن تجویز کیا۔ قوت دل و دماغ آزما کر انھوں نے طے کرلیا کہ نہ بے ہوشی سونگھانے کی ضرورت ہے، نہ جسم کو بے حس بنانے کی ضرورت۔ بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں قوی دل کے کہ وہ خود کہہ دیتے ہیں ڈاکٹر سے کہ بیہوشی نہ سونگھایئے، اور جناب ہاتھ بڑھا دیا کہ انگلی قطع کی جائے۔ جس وقت انگلی قطع ہو رہی ہے اس وقت چہرہ متغیر ہوگیا۔ یہ تو خاصیّت ہے درد کی۔ ایک متحمل آدمی بھی ضبط کے لئے دانت بھینچ لیتا ہے۔ زبان سے اف بھی نکل گئی، یہ خاصیت ہے تکلیف کی۔ لیکن عین جس وقت چہرہ متغیر ہو رہا ہے، عین جس وقت زبان سے اف کہہ رہا ہے، یہ سمجھ رہا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ ٹھیک ہو رہا ہے۔ بس یہی مطالبہ ہے ایمان کا ہر بندہ سے۔ تمہارا بھائی جدا ہوگیا، تم رو رہے ہو، یہ تو خاصیت ہے غم کی۔ تمہارا بھائی اٹھ گیا، تمہاری کمر ٹوٹ گئی، یہ تو خاصیت ہے غم کی۔ کسی کا سہاگ لٹ گیا، وہ بیوہ بین کر رہی ہے، یہ تو خاصیت ہے اس غم کی۔ اس خاصیت کو خالق فطرت نہیں منع کرتا۔ مگر عین جس وقت رو رہے ہو، عین اسی وقت جب بین کر رہے ہو، عین اسی وقت جب چہرہ تمہارا متغیّر ہوگیا، یہ سمجھتے رہو کہ جو قضائے الٰہی سے ہوا وہ ٹھیک ہوا۔ میں سمجھتا ہوں اس کے لئے بھی سمجھانے کے واسطے کسی گہرے منطق و فلسفہ کی ضرورت نہیں ہے۔ جو ہوا وہ ٹھیک ہوا۔ اس کے لیے بس دو باتیں سمجھنا ہیں۔ ایک یہ کہ قلم قضا جس کے ہاتھ میں ہے، وہ ہمارا

دشمن نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ وہ جاہل نہیں ہے۔ کیونکہ کسی کے ساتھ کوئی برائی کی جاتی ہے، تو وہ دو ہی صورتیں ہیں۔ یا دانستہ یا نادانستہ۔ دانستہ برائی وہ کرے گا جو دشمن ہو، اور نادانستہ برائی وہ کرے گا جو جاہل ہو۔ خالق ہمارا دشمن بھی نہیں تاکہ جان کر برائی کرے، اور بے شعور بھی نہیں تاکہ نادانستہ ہمارے ساتھ برائی کرے۔ لہٰذا کوئی پہلو اس کے عمل میں برائی کا نہیں پیدا ہوتا۔ بس یہ چیز پیش نظر رہے اور دل کی گہرائیوں میں یہ تصوّر راسخ رہے تو پھر ناممکن ہے کہ انسان صبر کے جادے سے ہٹ جائے۔ آنکھوں کے آنسو نہ دیکھئے، اس سے بات کر کے دیکھئے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ جو کچھ ہوا اسے وہ معاذ اللہ یہ سمجھتا ہے کہ غلط ہوا۔ اگر یہ دیکھ لیجئے تو سمجھ لیجئے کہ ایمان اس کے دل کی تہوں میں جاگزیں نہیں ہے۔ بے شک شرع کی رعایتوں میں بڑی وسعت ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی زبان سے بیتابی میں کچھ کلمات کفریہ آئیں تو ہم فتویٰ لکھتے وقت اسے تقاضائے اضطرار قرار دے کر حکم کفر جاری نہ کریں، مگر آج کل تو علم النفس ایک مستقل فن بن گیا ہے۔ اس پر ڈگریاں دی جاتی ہیں۔ امتحانات ہوتے ہیں۔ علم النفس کے مسلمات کی روشنی میں دیکھئے تو جب تک دل کے کسی طبقہ میں ذہن کے کسی حصہ میں، تحت الشعور کی کسی منزل میں یہ تصورات نہ ہوں، عالم اضطراب میں زبان پر نہیں آسکتے۔ اضطرار اور اضطراب میں ایسے کلمات کا زبان پر آنا، اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان کے ریشے دل کی تہوں میں جمے نہیں ہیں۔ یہ بس ظاہری سطح پر ایمان کے تقاضے ہیں، اس لئے اضطرار اور اضطراب کی منزل میں آکر دل کے اندر کی گہرائیاں ابھر کے سامنے آگئیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ بس یہی معیار صبر پیغمبرؐ خدا نے پیش کیا ہے۔ جب جناب ابراہیمؑ آپ کے فرزند جن سے آپ کو محبت فطری طور پر ہونا ہی چاہئے تھی، اس لیے کہ جناب خدیجہ کے بطن سے شروع میں آپ کے کئی صاحبزادے تولد ہوئے تھے جو ذرا ذرا سی عمر میں وفات پا گئے۔ اب مدّت کے بعد گویا آپ کی عمر کی آخری منزل میں خداوند عالم نے جناب ماریہ کے بطن سے آپ کو یہ صاحبزادہ عطا کیا۔ تو اس سے محبت و الفت ہونا ہی چاہئے تھی، مگر مشیّت ربّانی سے تین چار برس کی عمر میں وہ بھی بیمار ہوئے۔ وہ بیماری ان کے لیے پیام موت ثابت ہوئی۔ جب ان کے احتضار کا عالم تھا تو پیغمبر خداؐ سرہانے بیٹھے تھے اور آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور آپ فرما رہے تھے **یاابراھیم انا بفراقک محزونون** اے ابراہیم میں تمہاری جدائی کا بڑا صدمہ ہے۔ تو عین اس وقت جب حضرتؐ کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے، حاضر الوقت اشخاص میں سے کسی نے یہ کہہ دیا **انت یا رسول اللّٰہ و تبکی** ''آپ یا رسول اللہ اور گریہ فرمائیں؟'' اس لب ولہجہ کے ساتھ سوال کے اندر یہ چیز مضمر ہے کہ یہ گریہ آپ کی شان کے خلاف ہے۔ اب جو جواب دیا ہے پیغمبرؐ نے وہ دیکھنے کا ہے۔ حضور! رسولؐ نے یہ جواب نہیں دیا کہ بھائی معاف کرنا، اس وقت بشریت کی وجہ سے میں رو دیا اسے مسند نہ بناؤ۔

نہیں، یہ جواب نہیں دیا۔ کوئی معذرت اپنے اس عمل پر نہیں فرما رہے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں **ان القلب لیحزن و ان العین لتدمع لکنّا لا نقول الاما یرضی الربّ**۔ اب جو کچھ میں شروع سے اس وقت تک عرض کر چکا۔ گھنٹہ سوا گھنٹہ جتنا وقت ہوا ہو وہ پوری شرح اس متن کے ضمن میں داخل ہے، اور یہ پیغمبرؐ کے کلام کی خصوصیت ہے، یعنی مختصر لفظوں میں معانی کے دفتر سمائے ہوئے ہوتے ہیں۔ روز مرّہ کی بات چیت ہے لیکن اس میں پورا معیار صبر بیان فرمادیا ہے۔ فرماتے ہیں: دل تو رنجیدہ ہوتا ہی ہے۔ کیا مطلب یعنی احساس غم تو فطرت قلب ہے۔ **وانّ العین لتدمع** اور آنکھ تو اشک بار ہوتی ہی ہے۔ وہ دل کی فطرت، یہ آنکھ کی فطرت ہے **لکنّا لا نقول الا مایرضی الرب** لیکن ہماری زبان پر کوئی کلمہ ایسا نہیں آسکتا جو رضائے رب کے خلاف ہو، یہ ہے معیار صبر **رضا بقضائه و تسلیماً لامر ہ** قضائے الٰہی پر راضی ہیں۔ امر الٰہی پر سر تسلیم خم کئے ہیں۔ اور میں کہتا ہوں کہ ایسی موت تو پھر بڑی اچھی ہے کہ کسی اور کے ہاتھ سے ہو۔ یہاں

تو اگر کوئی سابق عمر کی غلطیاں بھی ہیں، تو ان غلطیوں کا کفارہ اس طرح کی موت بن جاتی ہے جو ظالم کے ہاتھ سے ہو۔ پھر وہ ظالم درحقیقت ذمہ دار اس کا بن جاتا ہے اور یوں بہرحال ان معنوں میں تو قضائے الٰہی کے تحت وہ بھی ہے کہ اللہ جب چاہے تو ظلم کی راہ میں رکاوٹ پیدا کردے اور ظلم کا حربہ کارگر ہی نہ ہو، لیکن یہ اگر سنّت الٰہیہ رہا کرتی تو کوئی نبیؑ قتل ہی نہ ہوتا۔ پھر تلوار اس بادشاہ کی یحییٰؑ کی گردن پر بے اثر ہوجاتی۔ پھر وہ آرہ اس کی کاٹ ختم ہی ہوجاتی جو جناب زکریاؑ کے جسم کو دو پارہ کرنا چاہتا تھا اور میں کہتا ہوں کہ وہ پتھر پھر ہوا میں منتشر ہوجایا کرتے جو جسم رسولؐ کی طرف روانہ کیئے جاتے تھے۔ لیکن سنّت الٰہیہ یہ نہیں رہی ہے کہ وہ ظالموں کے حربے کو دور ہی کیا کرے، ہٹایا ہی کرے۔ ہاں، اس کا کوئی بلند مقصد کسی کی اس دنیا میں بقا سے وابستہ ہو تو بطور اعجاز اس کی حفاظت کرتا ہے، جیسے ابراہیمؑ کے لئے آگ گلزار بنادی۔ ہمارے یہاں مذہبی روایات ہیں اور ہمارے ملک میں بھی اسی طرح کا واقعہ بتایا جاتا ہے کہ کسی حق پرست کو آگ میں ڈالا گیا اور وہ نہیں جل سکا۔ آگ بے اثر ہوگئی۔ مگر اس میں بھی دعوت دوں گا مسلمانوں کو بھی اور غیروں کو بھی کہ وہ اس حقیقت پر غور کریں کہ جب خدا نے اپنی قوت صرف کی تو جہاں تک ظالم کے عمل کے حدود اختیار ہیں، اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں پیدا کی یعنی یہ آگ مشتعل ہی نہ ہو، یہ نہیں ہوا کہ وہ زبان گنگ ہوجائے یہ نہیں ہوا کہ وہ ہاتھ شل ہوجائے۔ نہیں، جو کچھ تم کرسکتے ہو وہ کرلو۔ مگر یہ آگ ہمارے زیر فرمان ہے۔ ہم چاہیں تو جلائے گی۔ ہم نہ چاہیں گے تو نہ جلائے گی۔ وہ قادر مطلق جو آگ کو گلزار بنا سکا وہ اگر چاہتا تو نمرود کی زبان گنگ ہوجاتی، وہ حکم ہی نہ دے سکتا کہ آگ میں جلادو۔ وہ چاہتا تو وہ ہاتھ شل ہوجاتے جو ابراہیمؑ کو لے جانا چاہتے تھے۔ وہ چاہتا تو لکڑیاں اثر حرارت کو قبول ہی نہ کرتیں۔ وہ آگ مشتعل ہی نہ ہوتی، اور وہ چاہتا تو ابراہیمؑ کو نظر خلق سے اوجھل کردیتا۔ لیکن حضور یہ کچھ بھی ہوجاتا، تو نہ ظالم کا ظلم انتہا تک سامنے آتا اور نہ صابر کا صبر سامنے آتا۔ سب سے پہلے ذرا نفسیاتی طور پر تجزیہ کیجئے کہ ظالم کا اصل مطلب آخر ہوا کیا کرتا ہے اور باطل پرست قوتوں کا اصل مقصد کیا ہوتا ہے؟ براہ راست یہ مطلب ہی نہیں ہوتا کہ حق پرست کی زندگی کا خاتمہ کردیا جائے، اس لیے کہ حق پرست کی زندگی کا خاتمہ کرنے سے ان کا مطلب کہاں پورا ہوتا ہے۔ پہلا نصب العین تو یہ ہوتا ہے کہ اس کو حق کے راستہ سے ہٹایا جائے۔ اس کے لیے ڈراتے ہیں۔ دھمکاتے ہیں، شدت کے ساتھ مظالم کرتے ہیں۔ تمام مصائب لاتے ہیں تاکہ یہ راہ حق سے ہٹ جائے۔ جب یہ راہ حق سے نہیں ہٹتا تو درحقیقت یہ عملاً اعلان شکست ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کا خاتمہ کردیا جائے۔ یہ اپنی شکست کا غصّہ ہوتا ہے کہ اسے پھر راستہ سے ہی ہٹا دیں گے۔ مثلاً اگر براہ راست نصب العین ایک آدمی کا جلانا ہو تو ذرا غور کیجئے کہ اس کے لئے کتنی لکڑیاں درکار ہوں گی۔ بس جن کے شعلے ایک انسان کے جسم کا احاطہ کرسکیں لیکن آپ کو معلوم ہے۔ ہوسکتا ہے روایتوں میں کچھ مبالغہ ہوگیا ہو۔ مگر غیر معمولی کچھ بات تو تھی جو روایتوں میں یہاں تک آیا ہے کہ اتنے آگ کے شعلے بلند تھے کہ طائر ہوا میں پرواز نہیں کرسکتے تھے اور میں کہتا ہوں کہ درایتاً غور کیجئے تو ظاہر ہے کہ اگر آگ غیر معمولی حدّت کی نہ ہوتی تو منجنیق میں رکھ کر پھینکنے کی کیا ضرورت تھی؟ کوئی جاکے ڈال دیتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اثر شدت آتش کا اتنی دور تک گرمی پہنچا رہا تھا کہ کوئی آدمی قریب جاکر نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس کے لیے منجنیق تجویز کی گئی۔ وہ ہماری ہندوستانی زبان میں شاید گوپھن کہلاتی ہے۔ ایک ایسی شئے کہ جس میں بڑے بڑے پتھروں کو رکھ کر مارتے ہیں تو وہ دور تک جاتے ہیں۔ بس منجنیق اس کی بڑی قسم ہے تو ایک آدمی کو جلانے کے لیے اتنا اہتمام؟ کسی مجمع کو جلانا نہیں تھا۔ بس ایک متنفس کو جلانے کا مقصد تھا، مگر حقیقت میں یہ تو نفس کو متاثر کرنے کی کوششیں تھیں۔ اعلان ہورہا ہے۔ بادشاہ کی طرف سے کہ فلاں دن ابراہیمؑ کو جلایا جائے گا۔ اس طرح تاریخ مقرر ہوتی ہے۔ اس

کے بعد اہتمام ہوتا ہے۔لکڑیوں کی جمع آوری کا کہا جاتا ہے کہ یہ منتیں مانتے تھے لوگ کہ ہمارا یہ کام ہوجائے تو ایک گٹھا لکڑی کا لاکر ڈالیں گے۔ تاکہ یہ کار خیر گویا انجام پائے۔ تو اس اہتمام سے لکڑیاں جمع ہورہی ہیں۔اب اس لکڑی میں آگ دی گئی۔ اب اسے دہکایا جارہا ہے۔اس آگ کے شعلے اونچے ہورہے ہیں۔کیا ان شعلوں کا چرچا جو اتنے ہزار برس کی مسافت طے کرکے ہم تک پہنچ گیا، اس کا ذکر ابراہیمؑ کے کانوں تک نہیں جارہا تھا۔ضرور وہ سن رہے تھے، مگر وہ اس طرح سن رہے تھے کہ جیسے یہ سب اہتمام کسی اور کے لئے ہورہا ہے، ان سے مطلب نہیں ہے۔آخر ہار گئی کوشش باطل کی حق پرست کو راہِ حق سے ہٹانے میں۔اب یہ تو اپنی بات کا نبھانا ہے کہ سب کچھ کیا ہے تو جلا بھی دو۔اب کیا لوگوں کے سامنے ہماری رہے گی جو خود ہی کہہ دیں گے کہ نہ جلاؤ۔مگر کیا جلانے سے مقصد پورا ہوا؟ نہیں۔حق پرست کا ثبات اور نمایاں ہوگیا۔میں کہتا ہوں حق کی قیمت نمایاں ہوگئی۔جو ہر حق کی قدر سامنے آگئی جو اس کے پہلے تک سامنے نہیں تھی، اور اگر کہیں خدا کی قدرت بیچ میں سدّ راہ ہوجاتی، وہ زبان ہی گنگ ہوجاتی، وہ ہاتھ ہی شل ہوجاتے تو نمرود بھی بعد میں کہہ سکتا تھا بات بنانے کو کہ میں جلاتا تھوڑے ہی ، میں تو دھمکا رہا تھا۔اور جناب ابراہیمؑ کے متعلق بھی غلط فہمی رہ جاتی کہ وہ تو خدا کی قدرت بیچ میں آگئی، ورنہ آخر تو انسان کا نفس تھا کہیں پر تو لرز جاتے ہی، کہیں پر تو ہمت ہار ہی جاتے۔تو خالق نے خاموشی کے ساتھ دیکھا۔جو تم کر سکتے ہو کرو۔روشن کر رہے ہو آگ، روشن کرلو۔شعلے بھڑکتے ہیں، بھڑکیں۔اب کون چیز ایسی رہ گئی جو نمرود کہے کہ میں یہ تو نہ کرتا۔کوئی ایسی چیز نہ رہ گئی اور کون ایسی بات رہ گئی جسے کوئی کہہ سکتا کہ ابراہیمؑ اسے تو سہہ نہ سکتے۔کیا چیز رہ گئی جسے نہ سہہ سکتے۔معلوم ہوا، خدا کی قدرت خاموش رہی جب تک انسانی کارگزاری رہی۔بس جہاں سے انسانی طاقت ختم ہوئی، وہاں سے اللہ کی قدرت شروع ہوئی۔ اب جب جسم ابراہیمؑ منجنیق سے پھینکا گیا، تو آگ گلزار ہوگئی۔

لیکن یہ ضرور نہیں کہ اس کے انبیاءؑ اور اولیاء کے لئے ہمیشہ ایسا ہوتا رہے۔ چنانچہ جناب زکریاؑ کے لیے آرے کو بے اثر نہیں بنایا گیا۔ جناب یحییٰؑ کے لیے تلوار کی باڑھ کو کند نہیں کیا گیا، اور یہاں تک کہ اپنے حبیبؐ کے اوپر ان پتھروں کی تاثیر ختم نہیں کی گئی۔اسی طرح اہل بیتؑ رسولؐ نے شدید سے شدید مصائب کو برداشت کیا اور حق کے جادے سے قدم نہیں ہٹایا۔بے شک یہی صبر کا معیار ہے، لیکن فطری اثر کے تحت گریہ بھی کرتے رہے، گریہ پیغمبروںؑ نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ حضرت یعقوبؑ کے بارے میں خود قرآن میں آیا ہے کہ جب ان کے فرزند حضرت یوسفؑ کو ان کے بھائیوں نے چاہ میں ڈال دیا اور کہا کہ ان کو بھیڑیا لے گیا تو یعقوبؑ کی آنکھیں رنج و غم سے سفید ہوگئیں۔وہ کہتے تھے **اسفیٰ علی یوسف** ہائے افسوس یوسف۔اب یہاں ایک اور پہلو پر غور کر لیجئے۔کہا جاتا ہے کہ شہید تو زندۂ جاوید ہوتا ہے لہٰذا شہید پر نہیں رونا چاہئے تو میں پوچھتا ہوں کہ حضرت یعقوبؑ جو یوسفؑ پر رو رہے تھے تو مرنے والے پر رو رہے تھے یا زندہ پر رو رہے تھے۔کوئی مسلمان یہ نہیں سوچ سکتا کہ انہیں ان کے زندہ ہونے کا علم نہیں تھا، اس لیے کہ خود قرآن میں یہ بھی ہے کہ عین اس وقت جب رو رہے تھے کہتے تھے ''**یٰبنیَ اذهبوا فتمسسوا من یوسف واخیه**۔اے بیٹو جاؤ اور ڈھونڈھو یوسف کو اور اس کے بھائی کو''**ولا تیئسوا من روح اللّٰہ**''اور خالق کی عنایت سے ناامید نہ ہو۔اگر جانتے ہوتے کہ مر گئے ہیں تو کہتے کیوں کہ جاؤ تلاش کرو۔ پھر اس کے بعد میں جب وہ قمیص آیا ہے۔ **فلما ان جآء البشیر القٰه علی وجهه فارتد بصیرا** جب بشیر نے لاکر قمیص چہرہ پر ڈالا اور آنکھیں روشن ہوگئیں تو''**قال الم اقل لکم انی اعلم من اللّٰہ ما لا تعلمون**'' کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔اب تو بات صاف ہوگئی کہ جانتے تھے کہ زندہ ہیں پھر بھی رو رہے تھے۔تو حضور والا قرآن کی رو سے کسی کو ہم جانتے ہیں کہ زندہ ہے پھر بھی رو رہے ہیں تو اعتراض کی کیا بات ہے۔

پھر یہ کہ وہ تو زندہ تھے اسی دنیا میں اور یہ حیات جو شہیدوں کی ہے عالم معنی کی حیات ہے۔ ورنہ وہ ظاہری حیثیت سے تو مرتے ہی ہیں اور اس کی دلیل قطعی میں شریعت اسلام کی رو سے پیش کرتا ہوں۔ اگر شہادت میں ظاہری موت نہ ہوتی تو بیوہ کو حق دوسرے عقد کا نہ ہوا کرتا۔ اگر شہادت میں ظاہری موت نہ ہوتی تو مال متروکہ قرار نہ پاتا اور اگر شہادت میں ظاہری موت نہ ہوتی تو عہدہ دوسرے شخص کی طرف منتقل نہ ہوتا۔ شیعی نقطہ نظر سے یہ استدلال ہے کہ امامؑ کے بعد دوسرا امامؑ اس کی حیات میں نہیں ہوسکتا، تو اگر حضرت سید الشہداؑ کی اس طرح کی زندگی مانی جائے تو موت ظاہری کے بالمقابل ہے تو امام زین العابدینؑ کی امامت قائم ہی نہیں ہوسکتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ حیات اور، اور یہ موت اور ہے لیکن وہ حیات تو اسی دار دنیا کی حیات تھی جس پر یعقوبؑ رو رہے تھے، وہاں آپ اعتراض نہیں کرتے اور یہاں جو کسی زندۂ جاوید کی عالم معنی کی حیات ہے، اس میں فرماتے ہیں کہ زندہ کو کیوں رویا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ متفق علیہ روائتیں دیکھئے۔ ہم تو آج رو رہے ہیں اور رسولؐ خدا جب بچّہ پیدا ہوا اور رسولؐ کی گود میں لاکر دیا گیا ہے تو پیغمبرؐ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور حاضر الوقت اشخاص میں کسی نے کہا کہ یارسول اللہؐ یہ تو خوشی کا مقام ہے رونے کا کیا سبب ہوا؟ آپ نے فرمایا کہ تمھیں معلوم نہیں کہ اس پر کیا مصیبتیں پڑیں گی۔ تو اب رسولؐ سے پوچھئے کہ زندہ کو کیوں رو رہے ہیں۔ اس وقت تو حسینؑ گود میں ہیں۔ آنکھوں کے سامنے زندہ موجود ہیں اور پھر گریہ فرما رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ گریہ موت پر نہیں ہوتا، مصائب پر ہوتا ہے۔ ان مظالم پر ہوتا ہے جو اس پر ظالموں نے کئے ہیں اور خود پیغمبر خداؐ پر، دنیا کو معلوم ہے کہ صحابہ نے اتنا گریہ کیا، اتنا غم ہوا کہ شاہ عبدالحق دہلوی فرماتے ہیں کہ بعض لوگ دیوانہ ہو کر گریبان پھاڑ کر جنگلوں میں نکل گئے۔ پہاڑوں میں زندگی بسر کی۔ جناب بلالؓ نے شہر چھوڑ دیا۔ شام کی طرف چلے گئے۔ عہد کرلیا کہ اب پیغمبرؐ کے بعد کسی کے لئے اذان نہ دوں گا۔ دمشق میں کچھ دن رہے تھے کہ رسوؐل کو خواب میں دیکھا فرماتے ہیں کہ ہم جو نہیں رہے تو تم نے ہمارا مدینہ بھی چھوڑ دیا۔ بے تحاشہ خواب سے جیوں ہی بیدار ہوئے، بغیر سامانِ سفر کے مرکب پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ یہاں مدینہ میں خبر ہو گئی کہ مؤذن رسولؐ آرہے ہیں تو عالم یہ ہوا کہ روایت میں ہے کہ پردہ نشین عورتیں گھروں سے نکل آئیں۔ تمام خلق بیرون مدینہ پہنچ گئی اور یہ فقرہ ہے تاریخ میں کہ ''مارائ فی المدینة اکثر باکیا وباکیة ''وفات رسولؐ کے بعد سے مدینہ میں یہ کہرام اتنے رونے والے مرد اور رونے والی عورتوں کا ہجوم اور ہنگامہ نہیں سنا گیا تھا، جیسا کہ اس دن تھا جب بلال آئے تھے۔ دنیا تو ان کے استقبال کو آئی تھی اور یہ سیدھے روضۂ رسولؐ پر پہنچے تو حسنؑ اور حسینؑ کو دیکھا۔ بس بڑھ کے ان کو کاندھوں پر اٹھا لیا۔ اس دوش پر حسن مجتبیٰؑ اور اس دوش پر حسینؑ۔ اب لوگ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں دے دیجئے انہیں، آپ کو تکلیف ہو رہی ہوگی۔ یہ کہتے ہیں کہ مجھے تو وہ منظر یاد ہے جب رسول خداؐ انہیں اپنے کاندھوں پر لیتے تھے۔ میں تو فخر محسوس کررہا ہوں کہ میں انہیں اپنے کاندھوں پر چڑھائے ہوئے ہوں جو راکب دوش رسولؐ تھے۔ اب فاطمۂ زہراؑ کے بیت الشرف پر سلام کرنے آئے۔ سیدۂ عالم نے کہلوایا کہ اے بلال! جب سے بابا دنیا سے اٹھے تمہاری آواز اذان ہی سننے میں نہیں آئی۔ بلال نے عرض کیا کہ حضور میں نے عہد کیا ہے کہ رسولؐ کے بعد کسی کے لیے اذان نہیں کہوں گا جناب فاطمہ زہراؑ نے کہلوایا کہ اے بلال تمہیں میرے حق کی قسم ہے کہ ایک دفعہ میرے لیے اذان دے دو۔ ہاں میں سمجھتا ہوں کہ جناب بلال عارفِ حق فاطمہ زہراؑ تھے۔ جب یہ سنا کہ تمہیں میرے حق کی قسم ہے اور اس کے تحت محسوس کیا کہ میں نے تو قسم کھائی ہے کہ پیغمبرؐ کے سوا کسی کے لیے اذان نہ کہوں گا، یہ فاطمہؑ کے لیے اذان دوسرے کے واسطے اذان نہیں ہے یہ ان کے لیے اذان دینا ان کی حق کی ادائیگی کے لیے اذان دینا درحقیقت پیغمبرؐ خدا کی خاطر اذان دینا ہے تو سمعاً وطاعۃً کہنے لگے: ''ضرور تعمیل

حکم کروں گا۔'' سیدھے مسجد میں گئے۔ ماذنہ پر چڑھے۔ بلند آواز سے کہا: اللہ اکبر۔ یہ سننا تھا کہ بیٹی کو باپ کا زمانہ یاد آ گیا اور عورتوں کا جو انداز ہوتا ہے بین کا۔ فاطمہ زہراؑ نے کہا ''بابا! بلال نماز کا اعلان کر رہے ہیں۔ آپ تیاری نہیں کرتے جانے کی مسجد میں!'' اسی طرح بلال اذان کہتے جاتے ہیں اور سیدہؑ کا گریہ زیادہ ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ جب بلال نے کہا **اشھد انّ محمدالرسول اللہ ﷺ** تو سیدہؑ پر اتنا گریہ غالب ہوا کہ غش کھا کر گر گئیں، اور ایک کنیز آئی کہتی ہوئی کہ بس بلال خاموش رہو کہ قریب ہے بیٹی رسولؐ کی دنیا سے رحلت کر جائے۔

بس ارباب عزا میں کہتا ہوں کہ حضرت فاطمہ زہراؑ نے بڑے اہتمام سے باپ کا نام سنا تھا۔ مگر یہ اثر سکینہؑ کے دل سے کوئی پوچھے کہ انہوں نے حسینؑ کے بعد ان کا نام ان کا ذکر کس کس انداز میں سنا۔ غرض یہ سیدۂ عالمؑ کے گریہ کی کیفیت تھی اپنے باپ کے غم میں۔ اب ذرا اس پہلو پر غور کیجئے کہ حضرت سیدۂ عالمؑ جو اپنے باپ کو رو رہی تھیں، وہ جانتی تھیں کہ باپ میرا کس مرتبے کا ہے۔ جانتی تھیں کہ پیش خدا اس کا کیا درجہ ہے۔ مقصد کائنات ہے۔ افضل انبیاء و مرسلینؐ ہے۔ کعبۂ خلائق ہے اور آخرت کے لئے پہلے ہی خبر آ گئی تھی کہ آپ کو اتنا ملے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے۔ یہ سب بھی معلوم ہے، مگر باپ پر فاطمہؑ جتنا روئی ہیں دنیا میں کوئی بیٹی اپنے باپ کو اتنا نہیں روئی۔ عالم یہ تھا کہ نہ دن کو قرار تھا اور نہ رات کو سکون تھا، یہاں تک کہ اہل محلہ نے حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے پاس آ کر کہا کہ دختر پیغمبرؐ خدا سے ہماری طرف سے عرض کر دیجئے کہ دن رات جو روتی ہیں تو ہمارا کھانا پانی اور رات کا سونا ختم ہو گیا۔ نہ خواب ہے، نہ خور ہے، بالکل دن رات ہم بھی اسی تاثر میں رہتے ہیں۔ یا دن کو گریہ فرمائیں، رات کو خاموش رہیں یا رات کو گریہ فرمائیں، دن کو خاموش رہیں۔ میں کہتا ہوں کتنا ہی مہذب انداز ہو مگر بر بنائے محبت ہمیں اس فرمائش کے سننے سے اذیت محسوس ہوتی ہے۔ کسی بیٹی سے یہ کہنا اور پھر رسولؐ ایسے باپ کی بیٹی سے، جس کے لئے غیروں کا یہ عالم ہو کہ وہ گریبان پھاڑ کر نکل گئے اور اس کی بیٹی سے یہ فرمائش ہو۔ مگر خیر۔ یہ افراد تو خلق عظیم کے مالک کے ورثہ دار ہیں۔ حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے پیغام پہنچا دیا کہ اہل مدینہ آئے ہیں۔ یہ کہتے ہیں۔ فاطمہؑ نے پہلے تو یہ کہا کہ یا علیؑ ان سے کہہ دیجئے کہ تمہاری زحمت کا دور زیادہ طولانی نہیں ہے۔ چونکہ یہ حدیث مستند کتب میں درج ہے کہ رسولؐ خدا کا جب وقت احتضار قریب تھا تو ایک دفعہ فاطمہ زہراؑ کو بلا کر کچھ کہا چپکے سے۔ تو آپ رونے لگیں اور دوسری دفعہ آپ نے قریب بلا کر کچھ فرمایا۔ آپ مسکرانے لگیں۔ جب بعد میں فاطمہؑ زہرا سے اس کا سبب پوچھا گیا تو آپ نے کہا پہلی دفعہ جو روئی تھی تو رسولؐ نے مجھے اپنے وفات کی خبر دی تھی کہ بیٹی اب میں دنیا سے جانا چاہتا ہوں، تو میں بے ساختہ رو دی، اور دوسری دفعہ جو میں ہنس دی تو پیغمبرؐ نے مجھے پاس بلا کر پھر یہ فرمایا کہ میرے گھر والوں میں سب سے پہلے تم میرے پاس پہنچو گی، بس یہ سن کر میں خوش ہو گئی۔ تو رسولؐ خبر دے چکے تھے۔ فاطمہ زہراؑ کو معلوم تھا، ارشاد فرمایا کہ ان سے کہہ دیجئے کہ تمہاری زحمت کا زمانہ طولانی نہیں ہے۔ جلدی ہی میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں گی، اور تمہاری زحمت ختم ہو جائے گی۔ پھر بھی حضرت فاطمہ زہراؑ نے ان کی شکایت کا خیال فرمایا کہ اب آپ صبح کو بچّوں کو لے کر جنت البقیع میں چلی جایا کرتی تھیں اور دن بھر اپنے باپ کو رویا کرتی تھیں۔ دیکھا آپ نے۔ فاطمہؑ کو بھی رونے سے کس حد تک روکا گیا۔ مگر مہذب انداز میں، پیش کش اور درخواست کے طور پر، مگر کیا میں بتاؤں کہ سکینہؑ کو اپنے باپ کے غم میں کس کس طرح روکا گیا رونے سے۔ اب کچھ جملے مصائب کے سن لیجئے کیونکہ درحقیقت ہمارے یہاں جو سیوم و چالیسویں کی مجلسیں ہوتی ہیں تو اس میّت کی مجلس نہیں ہوتی۔ فاتحہ خوانی اور اہدائے ثواب میت کے لیے ہوتا ہے لیکن مجلس امام حسین علیہ السلام ہی کی ہوتی ہے۔ لہٰذا حاصل مجلس یہی ہے کہ آخر میں کچھ تذکرہ حضرت امام حسینؑ اور اہل بیت طاہرینؑ کا ہو۔ رسولؐ اور آل رسولؐ کا ذکر ہو، یہی اس میّت کے لیے باعث ثواب و تسکین روح

ہوتا ہے۔توحضور آج دنیا ہم سے کہتی ہے کہ حسینؑ کے غم میں کیوں اب تک روتے ہو؟ میں کہتا ہوں جنہیں حق تھا رونے کا انھیں رو لینے دیا ہوتا تو شاید اتنے عرصہ تک یہ رونا قائم نہ رہتا، مگر واقعہ تو یہ ہے کہ جنہیں رونے کا حق تھا انہیں رونے نہیں دیا گیا۔ ہاں جناب حمزہؑ کے غم میں رسولؐ نے یہ فرمایا تھا ''**اما عمی حمزۃ فلا بواکی لہ**'' میرے چچا حمزہؑ پر رونے والیاں نہیں ہیں۔ان کی ایک بہن تھیں صفیہ، تھوڑی دیر تک روکر خاموش ہوگئیں۔خواتین انصار نے سنا تو حمزہؑ کے گھر میں آکر ماتم کیا۔ میں کہتا ہوں رونے والے موجود ہوں اور رو نہ سکیں۔حسینؑ ابن علیؑ کو رونے والوں کی کمی نہ تھی۔حضرت زینبؑ، وام کلثومؑ ایسی بہنیں۔حضرت لیلیٰ و رباب ایسی بیویاں۔حضرت سکینہؑ اور رقیہؑ ایسی بیٹیاں۔حضرت زین العابدینؑ ایسا فرزند مگر ارباب عزا۔ یہ لوگ اپنے وارثوں کے غم میں روتے کیونکر۔اس لئے کہ ادھر تو وارث کی خبر آئی اور ادھر ظالم آگ لے کر خیموں کے پاس آگئے۔ارے کربلا میں تو کوئی اتنا نہ تھا جو جاکر خبر پہنچادے کہ تمہارے وارث پر کیا گذری۔اس خدمت کو حسینؑ کے اسپ باوفا نے انجام دیا۔گھوڑا عرب کا فراست میں مشہور ہے۔توحضور اس نے آخری خدمت جو امامؑ کی انجام دی ہے وہ یہ تھی کہ جب دیکھا کہ میری پشت خالی ہوگئی ہے تو میں تو یہی خیال کرتا ہوں کہ اس نے ادھر دیکھا ادھر دیکھا۔اگر عباسؑ نظر آتے تو وہ جاکر اشارہ ان سے کرتا۔اگر علی اکبرؑ نظر آتے تو اشارہ ان سے کرتا۔مگر وہ سب تو زمین گرم پر خاک وخون میں غلطاں پڑے ہوئے تھے۔لہٰذا آخری کام جو اس نے کیا وہ یہ کہ پیشانی اپنی خون سے رنگین کی اور اس کے بعد سیدھا خیموں کی طرف گیا اور درخیمہ پر جاکر آواز ایک بلند کی۔روایت میں یہ ہے۔ اچھا روایتیں ضعیف بھی بہت ہیں تو میں کہتا ہوں کہ ذرا غور کیجئے۔روایت کی رو سے کہ اگر کوئی بی بی میدان میں موجود ہوتی تو ضرورت کیا تھی گھوڑے کو خیمہ کے دروازے پر جانے کی۔ اس لئے یہ روایت درست معلوم ہوتی ہے کہ جب گھوڑا خیمہ کے دروازے پر گیا تو سکینہؑ دروازے پر آئیں یہ سمجھیں کہ میرے باپ آئے ہیں۔جب آئیں تو دیکھا کہ باگیں کٹی ہوئی ہیں۔زین ڈھلا ہوا ہے۔جا بجا تیر پیوست ہیں۔اب خیمہ میں جاکر کہا: ارے میرے بابا شہید ہوگئے۔دیکھئے یہ ہے میعار صبر کہ شدّت مصیبت میں بھی جو بات نہ کرنا چاہئے وہ نہ ہونے پائے۔حسینؑ ایسے وارث کی خبر آگئی مگر بیبیاں جہاں حسینؑ بٹھا گئے تھے وہاں بیٹھی رہیں اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ اگر بیبیاں خیموں کے باہر ہوتیں تو خیموں میں آگ نہ لگائی جاتی۔پھر بھی یہ نہیں ہوا کہ بیبیاں اضطراب میں نکل کھڑی ہوئیں بلکہ روایت میں ہے کہ جب ایک خیمہ میں آگ لگتی تھی تو بیبیاں دوسرے خیمے میں چلی جاتی تھیں ۔جب دوسرے میں آگ لگتی تھی تو تیسرے خیمہ میں چلی جاتی تھیں۔یہ عالم تھا تو اب کہاں ممکن تھا کہ اپنے وارث کے غم میں صف بچھائیں، اپنے وارث کو روئیں۔اور اس کے بعد آپ کو معلوم ہے گیارہویں محرّم کو شہزادیاںؑ قید ہوگئیں اور ابھی تک جو مجاہدوں کا قافلہ تھا، وہ قیدیوں کا قافلہ بن گیا۔کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک قیدیوں کے لباس میں یہ شہزادیاں جارہی تھیں اور اس کے بعد امام زین العابدینؑ کا فقرہ موجود ہے، فرمایا کہ راہ کوفہ وشام میں ہم میں سے کسی کی آنکھ سے آنسو نکلتا تھا، تو اس کے سر کو نوک نیزہ سے اذیت دی جاتی تھی۔یہ عالم تھا۔جنہیں رونے کا حق تھا انہیں رونے نہ دیا گیا۔اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب سیاست وقت کے دباؤ سے یزید مجبور ہوا کہ رہا کرے اور امام زین العابدینؑ کو بلاکر پوچھا کہ میں نے اب تمہیں آزاد کیا۔تم چاہو تو یہاں رہو، چاہے مدینہ واپس جاؤ۔ بتاؤ تمہاری کیا مرضی ہے۔ اب یہ خاندان رسالت کا داب وآداب تھا۔فرمایا کہ میں اپنی طرف سے کچھ نہیں کہہ سکتا جب تک اپنی پھوپھی سے نہ پوچھ لوں۔آئے زندان شام میں جہاں مقید تھے۔آکر کہا پھوپھی ہمیں یزید نے رہا کیا اور اختیار دیا ہے چاہے یہاں رہیں، چاہے مدینہ جائیں، جناب زینبؑ نے فرمایا: پھر تم نے کیا کہا؟ کہا: میں بغیر حضور سے پوچھے کیا کہہ سکتا تھا۔کہا: جب تم نے میرے اور پر

(بقیہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔صفحہ ۴۷ پر)